© rasailojaraid.com

فکر و نظر............ اسلام آباد جلد: ۴۶ شمارہ: ۱،۲

کشفی صاحب آپ کے لیے، کشفی صاحب مزید آپ کے لیے

(ایک مطالعہ)

پروفیسر عبدالجبار شاکر

پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی (۱۲، مارچ ۱۹۳۲ء-۱۵ مئی ۲۰۰۸ء) ایک ممتاز استاد، اعلیٰ محقق، عظیم نقاد، اچھے شاعر، بہترین نعت گو، منفرد سیرت نگار، اعلیٰ مترجم، ماہرلسانیات، عمدہ خاکہ نگار، اچھوتے افسانہ نگار، بالغ نظر مدیر، سنجیدہ کالم نگار، ا ور باشعور ادیب ہیں۔ ان کی ۷۳ ویں اور ۷۵ویں سالگرہ کے موقع پر ان کے احباب ، رفقائے گرامی، ہم نشین اور ہم جلیس ، تلامذہ اور اہل خاندان نے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر جس اخلاص و محبت کے پیرائے میں اظہارِ خیال کیا ہے، انہیں آپ کی رفیقہ حیات محترمہ بلقیس شاہین نے دو جلدوں میں مرتب کرکے ۱۲ مارچ ۲۰۰۴ء اور ۱۲ مارچ ۲۰۰۶ء کو ان کی سالگرہ کے مواقع پر پیش کیا ہے، جسے ہم ایک مشرقی خانوادے کی مہذب اور اعلیٰ روایت قرار دے سکتے ہیں۔ مغرب میں علمی شخصیات کو خراج تحسین یا ہدیۂ تبریک پیش کرنے کے لیے Commemorative Volume یا ارمغانِ عقیدت پیش کرنے کا چلن بہت مدت سے موجود ہے۔ مگر اب مشرقی ادبیات میں بھی اس نوع کی یادگاری کتب لکھی یا لکھوائی جارہی ہیں۔ یہ مثبت تجربہ اب ایک مستحکم روایت میں ڈھلتا دکھائی دیتا ہے۔

''کشفی صاحب آپ کے لیے'' اس ارمغانِ عقیدت کی پہلی جلد ہے جس میں مرتبہ نے ''کائناتِ قلب و نظر'' کے عنوان سے انتساب کی جو چند سطور لکھی ہیں، ان میں مشرقی خاندانوں میں زوجین کے قلبی ر فاقت کی ایک سچّی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اس رفاقت کا نقطۂ کمال وہ آخری دو صفحاتی مضمون ہے جو مرتبہ نے ''عجزِ بیان'' کے عنوان سے سپردِ قلم کیا ہے۔ رفاقت کے اس امتحان میں سرخروئی کے لیے انہوں نے ارمغانِ سیرت سے ایک مثال کوکس عمدگی سے منتخب کیا ہے:

> '' اب سورج کسی ایسی عورت پر طلوع نہ ہوگا جس نے خدیجۃ الکبریٰ ؓ کی طرح اپنے شوہر کو ''توانائی'' دی ہو اور نہ کبھی یہ فضائے کائنات وہ صدا سن سکے گی جو ایک بیوی نے اپنے شوہر کی ''گواہی'' میں دی۔ یعنی اے پوچھنے والے کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟''

اس ارمغانِ عقیدت کی پہلی جلد میں چھوٹے بڑے ۳۴ مضامین ہیں ، جبکہ دوسری جلد ''کشفی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صاحب مزید آپ کے لیے‘‘ میں کل ۲۷ مضامین ہیں۔ دوسرے مجموعے میں مضامین کم مگر لوازمہ پہلی جلد سے دو گنا ہے۔ اس دوسرے مجموعے کا سب سے اہم مضمون بھی کشفی صاحب کی اہلیہ بلقیس شاہین کا ہے جو ’’ٹک ہونٹ ہلاؤں..........‘‘ کے عنوان سے کتاب کے آخر میں ۴۱ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس مضمون میں مرتبہ نے کشفی صاحب سے مراسم کی نصف صدی کو سمیٹا ہے جس میں رفاقت کے بیالیس سال بھی شامل ہیں۔ کشفی صاحب کی بیگم کے علاوہ اس مجموعے میں ان کے اعزاء و اقرباء کے بہت سے مضمون شامل ہیں۔ ان کے اکلوتے بیٹے احمد عاکف، چار بیٹیوں ، دامادوں، بھائیوں، بہنوں، بھتیجوں، بھانجیوں، پوتوں، پوتیوں، نواسوں اور نواسیوں تک کے محبت نامے اور تأثرات شامل ہیں۔ ارمغانِ عقیدت کی ان دو جلدوں میں ڈاکٹر یونس حسنی کا مضمون ’’شعلہ و شبنم کا آمیزہ‘‘ سب سے منفرد مضمون ہے جس میں کشفی صاحب کی شخصیت کے متضاد اور منفی پہلوؤں کا بھی جائزہ لیتے ہوئے تحلیلِ نفسی کا فریضہ انجام دیا گیا ہے۔ ان مجموعوں کے اکٹھے مضامین کا انفرادی جائزہ کسی طور پر مناسب نہیں ہے۔ البتہ ان کے مجموعی مطالعے سے پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب کی شخصیت کی جو تصویر سامنے آتی ہے اسے اختصار سے بیان کرنا دلچسپی اور افادے سے خالی نہ ہوگا۔

کشفی صاحب کا تعلق سادات کے خاندان سے ہے۔ آپ نجیب الطرفین سید ہیں۔ حضرت سید شاہ غلام رسول، رسول نما آپ کے جد امجد تھے۔ ان کے سجادہ نشین سید ابو محمد آپ کے والد گرامی تھے جو علمی اور ادبی دنیا میں ثاقب کانپوری کے نام سے معروف ہیں۔ ’’متاعِ درد‘‘ اور ’’روحِ جاوداں‘‘ ان کے اردو مجموعہ ہائے کلام ہیں۔’’ انتخابِ سودا‘‘ اور’’آریہ سماج کا آئینہ‘‘ ان کی تصانیف ہیں۔ علامہ اقبال سے مراسلت اور ملاقات رہی۔ کشفی صاحب اسی خانقاہی ماحول میں ۱۲ مارچ ۱۹۳۲ء کو کانپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کا مرحلہ گھر میں طے ہوا۔ مولانا سعید رزمی سے فارسی پڑھی اور اس درجہ استعداد حاصل کی کہ بچپن ہی میں فارسی زبان میں تقریر کرنے لگے۔ ۱۹۴۰ء کے قریب ایک عرب معلم سے عربی سیکھی۔ اسی سال لطیف اثر اور عبدالستار صاحب سے انگریزی سیکھی۔ مؤخرالذکر بعد میں کراچی میں کشفی صاحب کے شاگرد بھی رہے ۔ حلیم مسلم کالج کانپور میں چھٹی جماعت میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۵ء میں کرائسٹ چرچ کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۷ء میں انٹربورڈ الہ آباد سے ڈگری حاصل کی۔ اس دوران تحریک پاکستان کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہوئے اور پاکستان کی حمایت میں زبردست تقریریں کیں۔ یہ انہی جذبات کا نتیجہ ہے کہ خاندان کے فیصلے کے علی الرغم اپنے دوستوں محمد قسیم اور مرتضٰی شفیع کے ساتھ پاکستان چلے آئے اور کراچی میں مقیم ہوئے۔ سندھ یونیورسٹی سے بی اے آنرز میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۵۲ء میں جامعہ کراچی سے ایم اے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اردو کیا۔ ۱۹۶۷ء میں کولمبیا یونیورسٹی سے لسانیات میں ایم اے کیا۔ ۱۹۷۱ء میں جامعہ کراچی ہی سے ''اردو شاعری کا تاریخی اور سیاسی پس منظر، (۱۷۰۷ء-۱۸۵۷ء)'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی جس کا دوسرا ایڈیشن ادارہ ''نشریات'' لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں یہ افتخار بھی حاصل کیا کہ اسلامیہ کالج میں سٹوڈنٹ لیکچرار کے بطور تعیناتی ہوئی جس کی جامعہ کراچی نے باضابطہ منظوری بھی دی۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء تک اسلامیہ کالج، کراچی اور ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۹ء تک اردو کالج میں پڑھاتے رہے۔اسی سال کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تدریس سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک جاپان کی اوساکا یونیورسٹی میں اردو زبان اور مطالعہ پاکستان کے مضامین پڑھاتے رہے۔ یہاں کے طلبہ کے دلوں میں اردو اور اسلام ہر دو کے لیے لگن پیدا کی۔ کراچی یونیورسٹی میں ان جاپانی طلبہ کی خدمت کے لیے اپنی جیب سے خرچ کرتے رہے اور گھر پر ان کی ضیافتوں کا اہتمام کیا۔ ان میں سے ایک طالب علم اتاکا نے کشفی صاحب کے گھر کے دینی اور معاشرتی ماحول سے متأثر ہوکر اسلام قبول کرلیا۔ یہ قربت یہاں تک بڑھی کہ ان کی بھانجی کی شادی بھی اتاکا سے ہوگئی۔ ۱۹۹۲ء میں وہ جامعہ کراچی سے ریٹائرڈ ہوگئے اورپھر آخر عمر تک علمی اور تصنیفی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

کشفی صاحب کی تدریسی زندگی کے چالیس سال (۱۹۵۲ء-۱۹۹۲) بہت بھرپور دکھائی دیتے ہیں وہ ایک کامیاب اور ہر دلعزیز استاد تھے مگر ان کے ڈسپلن کی سختی ایک مثال کا درجہ اختیار کرچکی تھی جس کے باعث بعض اوقات ناگوار صورتیں پیدا ہوجاتی تھیں۔ ان کے پیریڈ کے دوران میں برآمدے میں سے گزرتے ہوئے دوسرے طلبہ بھی سہم کر چلتے تھے۔ کلاس کے اندر طلبہ کو ہمہ تن گوش اور کامل توجہ کے ساتھ بیٹھنا ہوتا تھا۔ وہ جدید و قدیم ادب کی روایات کے شناسا تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ وہ انگریزی ادبیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ نصابی ضرورتوں سے کماحقہ واقف تھے۔ تحقیق کا اسلوب ان پر بند نہیں تھا مگر تنقید میں ان کا شمار مثالی اساتذہ میں ہوتا ہے۔ تنقید کو تخلیقی آہنگ عطا کرنا ان کی انفرادیت ہے۔ اردو نظم و نثر کی تمام اصناف ان کی دسترس میں تھیں۔ اپنی جودتِ طبع اورتخلیقی فعالیت سے وہ اسباق کو پرلطف بنانے کا فن جانتے تھے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۶۳ء کو وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے حادثے سے دوچار ہوئے۔ ان کی پہلی رفیقہ حیات طاہرہ کشفی اپنے دو بچوں کے ہمراہ ایک حادثے کا شکار ہوگئیں۔ اس سانحے کو گزرے تیسرا دن ہوا تو کشفی صاحب کلاس روم میں موجود تھے۔ اس موقع پر ان کا یہ جملہ کہ ''میرا غم بڑا ہے یا میرا فرض'' ان کی معلمانہ شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ کشفی صاحب کے سارے شاگرد اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے پڑھانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے دوران میں کمرے میں ایک گھمبیر خاموشی چھائی رہتی۔ اگر کوئی طالب علم چاہے تو اپنی سانسوں کی رفتار اور تعداد خود سن سکتا تھا۔ اپنے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے منتخب لفظوں کی ایک آبشار گرتی دکھائی دیتی جس میں زیر بحث موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ موجود ہوتا۔ ان کا حافظہ بلا کا تھا۔ تجزیہ و تنقید کی صلاحیت مثالی تھی۔ کلاس روم سے باہر اور گھر پر وہ ایک دوسرے کشفی صاحب دکھائی دیتے جو ہمہ وقت اپنے طلبہ کی خدمت میں لطف محسوس کرتے۔ اس سلسلے میں ان کی دوسری رفیقہ حیات بلقیس شاہین صاحبہ کا طویل مضمون ایک خاصے کی چیز ہے جس میں ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو سمٹ آئے ہیں۔ انہیں کچھ عرصہ صدر شعبۂ اردو کی ذمہ داری نبھانا پڑی مگر یہ ان کے ذوق اور مزاج کے موافق نہ تھی۔ ان کی شخصیت میں شعلہ وشبنم اور جلال وجمال کی کیفیات بیک وقت جلوہ گر تھیں۔

ان کے قریبی احباب اور دوستوں کے رشحاتِ قلم سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت نازک مزاج، اصول پرست، حق گو، بیباک ، راست گو اور برملا تنقید کرنے والے تھے۔ ایسے شخص کو عملی زندگی میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ادارہ ادبیات پاکستان کے ایک اجلاس کی صدارت ایک مرکزی وزیر کررہے تھے۔ انہوں نے بھرے اسٹیج پر یہ بات کہہ دی کہ آپ کا ادب اور ادیبوں کے مسائل سے کیا تعلق ، آپ کو ایسی صدارت کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے۔ وزیر موصوف نے وضاحت کی کہ میں قرآن مجید کی تفسیر لکھ چکا ہوں اور قلم کے رشتے کو پہچانتا ہوں مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

کشفی صاحب کانپور میں لعل میاں کی عرفیت سے مشہور تھے۔ یہاں پر ان کے دوستوں پروفیسر حسنین کاظمی، سرشار صدیقی اور ڈاکٹر حنیف فوق وغیرہ کے تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بچپن سے بہت ذہین وفطین تھے، تقریر اور تحریر دونوں کا ملکہ میٹرک تک پہنچنے سے پہلے حاصل ہوچکا تھا۔ تحریک پاکستان کے ضمن میں وہ بڑے جری انداز میں تقاریر کرتے تھے۔ ان کا مزاج قلندرانہ ، گفتگو بے باکانہ اور زندگی کا رویہ مخلصانہ تھا۔ بچپن سے عبادت گزار تھے مگر عمر کے آخری حصے میں قلب کی گداختگی کا یہ عالم تھا کہ حضور ﷺ کا ذکر آتے ہی آنکھیں نم ہوجاتی تھیں۔ آخری سالوں میں حرمین کی حاضری مسلسل رہی۔ یہاں پر کہی جانے والی نعتوں سے ان کی ذہنی اور قلبی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے ۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ ان کا اشہب قلم سیرت کی وادیوں میں گل و گلزار کھلاتا ہے۔ یہاں انہوں نے ادبی ہنر، وسائل اور سلیقے کو مذہبی اور دینی تحریروں کی جاذبیت اور دلکشی میں سمو دیا۔ نعت اور سیرت ان کا اوڑھنا بچھونا بن گئے۔ ان کی سیرت کی بعض کتابوں کی عظمت کا قومی اور ملکی سطح پر اعتراف کیا گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہوں نے متعدد نعتیہ مجموعوں پر دیباچے سپردِ قلم کیے اور تنقیدِ نعت پر چند مضامین لکھے جن کے مطالعہ سے فنِ نعت گوئی کی باریکیوں اور لطافتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے مجموعۂ نعت ''نسبت'' نعت کے موضوع پر مضامین کے مجموعے ''نعت اور تنقیدِ نعت'' انتخابِ نعت کے مجموعے ''نقشِ سعادت اور ''وطن سے وطن تک'' کے مطالعے سے ان کی حبِ رسالت کی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ کشفی صاحب ۱۹۸۵ء تک کلین شیو خوش پوش تھے مگر اب ان کے چہرے پر شعائرِ انبیاء کا عکس عجیب بہار دکھا رہا تھا۔ زندگی کے آخری دو عشروں میں ان کی تحریروں کا رخ دینی ادب اور سیرت نگاری کی طرف مڑ گیا اور اس حوالے سے ان کی تحریریں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

کشفی صاحب کی پون صدی پر پھیلی ہوئی تحریریں ان کے علمی اور ادبی قد و قامت کو متعین کرتی ہیں۔ ان تحریروں کا موضوعاتی تنوع ان کے وسعتِ مطالعہ پر شاہد عادل ہے۔ انہوں نے سینکڑوں مضامین لکھے اور اس سے زائد اجتماعات میں خصوصی لیکچر دیے۔ وہ بہت سے علمی، دینی اور ادبی جرائد کے مدیر رہے۔ اخبارات و جرائد میں کالم اور مضامین لکھے۔ اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں لکھنے کا ملکہ بھی حاصل تھا۔ ان کے مضامین جن رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ان میں سخنور، دائرے، کاروانِ طب، السیرہ، نئی نسلیں، قلم قبیلہ ، فنون، الاسلام، تمثال ، خاتونِ پاکستان، روشنائی ،ہم سخن، ساقی، سیپ ،تعمیرِ افکار، نقوش، مہرِ نیمروز، آگہی، مضراب ، نئی قدریں، ماہِ نو، رفتار، قومی زبان، ادبِ لطیف ، تہذیب، الفاظ ، شاعر، دریافت ، پرواز، ہمایوں، اردو سائیکالوجی، پاک پنچ ، مجلّہ دلسینہ، الزبیر، حمایتِ اسلام ، آہنگ ، مراۃ الغیب، مشعل، نقاد، نگار، آئندہ ،تشکیل اور نعت رنگ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف اخبارات میں ان کے بیسیوں مباحثے بھی شائع ہوئے ہیں۔ مختلف علمی و ادبی مجالس میں انہوں نے صدارتی خطبات اور محاضرات بھی پیش کیے ہیں۔ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ایسی سب تحریروں کو ایک خاص موضوعاتی سلیقے سے جمع کیا جائے جس کے نتیجے میں ہمیں بہت سے عصری رجحانات اور موضوعات کا اندازہ ہو سکے گا۔

ان دونوں مجموعوں میں کشفی صاحب کے بارے میں وہ مضامین جو ان کی اہلیہ، بیٹے، بہو، بیٹیوں دامادوں، بھائیوں، پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں، بھانجیوں، بھتیجوں، اور بہنوں نے لکھے ہیں، ان میں ان کے خاندانی پس منظر، بچپن کی یادوں، گھریلو روایات، تعلیمی مراحل، گھریلو مشاغل، کھانے پینے کی دلچسپیوں، بچوں سے محبت، عزیزوں سے الفت، مطالعے کی عادات ، لباس و طعام ، عادات و اطوار، اندازِ گفتگو، آداب و رسوم، خدمت و ضیافت، شرارت اور مزاح، عبادات و وظائف، کھیلوں سے دلچسپی، بچوں کی تربیت، ضروریات اور آمدنی میں توازن، ہوسِ زر سے دوری، نمازوں کی پابندی اور اعزا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

و اقربا سے حسنِ سلوک جیسی تفصیلات ملتی ہیں۔ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ام ابیھا نے انہیں اپنی چاروں بیٹیوں کی بہترین تربیت کے باعث جنت کا ویزا ہولڈر قرارد یا ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام عزیزوں سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے انسان تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور خواہشوں کو عزیز رکھتے تھے۔

کشفی صاحب ایک کامیاب ادیب تھے۔ وہ ایک ایسا شجر سایہ دار تھے کہ جس کے سائے تلے بیسیوں ادیبوں نے پرورش پائی ہے۔ ان کے سینکڑوں شاگرد زندگی کی مختلف شاہراہوں پر بڑی کامیابی سے گامزن ہیں۔ ان کا ادبی کارنامہ بہت متنوع، متوازن اورمؤثر ہے۔ علامہ شبلیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کی طرح ان کی علمی زندگی کا اختتام بھی سیرت نگاری پر ہوا۔ انہوں نے اسلامی موضوعات کو ایک ادیبانہ رنگ دیا ہے۔ ان کی تحقیق ہو یا تنقید، ان کی نثر ہو یا نظم ہردو اسلامی تہذیب اور تمدن کے آہنگ میں ڈھلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ادب میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو بھیک اور مانگے تانگے کا اجالا سمجھتے تھے۔ وہ ادب کی تفہیم کو زبان کا نہیں بلکہ زندگی کی تفہیم کا مسئلہ جانتے تھے۔وہ ادب جو صرف ذہنی فرحت پیدا کرے مگر روح کو سرشار نہ کرے، ایک ادھوری اور ناپختہ کوشش ہے۔ وہ قیام پاکستان کے بعد کے ادبی رجحانات سے مطمئن تھے، ان کے نزدیک پاکستان میں اردو تحقیق، تنقید اور تخلیق کا معیار کسی دوسرے خطے سے زیادہ بلند ہے۔ ان کے ہاں اردو نصاب کی تبدیلی کی خواہش پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے اپنے عہد کو متاثر کیا ہے اور یہی ان کے بڑے ادیب اور عظیم شخص ہونے کی دلیل ہے۔

محترمہ بلقیس شاہین کی مرتبہ ان دونوں کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو شمع کی طرح جلتی ہیں، جگنو کی طرح چمک کر دوسروں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ ان کی فکر چاندنی کی طرح پھیلتی ہے اور ان کی سیرت خوشبو کی طرح بکھرتی اور دماغوں کو معطّر کرتی ہے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میؔر سے صحبت نہیں رہی

☆☆☆☆☆

© rasailojaraid.com